ڈاکٹر نجم الاسلام :

ہمارا قدیم طرز تحقیق

قدیم ہو یا جدید، تحقیق ایک انداز فکر کے اثر سے پروان چڑھتی ہے جو ہمیں شے کی حقیقت و حکمت جاننے کی طرف مائل کرتا ہے اور بیانات یا امور کی اصلیت کا کھوج لگانے پر آمادہ کرتا ہے، یہی علم کا منبع ہے، یہی اسکی توسیع یا اضافے کا وسیلہ۔

اس انداز فکر کی جھلک ہمیں مسلمانوں کی تاریخ کے آغاز ہی میں مل جاتی ہے۔ واقعات کی صحت معلوم کرنے کا اصول خود قرآن کریم نے یہ کہہ کر قائم کردیا تھا کہ جب کوئی فاسق خبر لائے تو اچھی طرح چھان پھٹک کر لیا کرو، اور مسنون دعاؤں میں بھی اس پہلو پر کیا کچھ زور دیا گیا جس کی بنا پر تحقیق کی اصطلاح کو سرچ اور ری سرچ پر یک گونہ ترجیح ہے، کیونکہ اِس میں طلب حق ہے اور اس میں صرف تلاش۔چنانچہ مسنون دعاؤں میں آتا ہے:

- اے اللہ تو ہمیں اشیاء کی حقیقتیں دکھا جیسی کہ وہ ہیں۔
- اےاللہ تو ہمیں حق کو حق دکھا اور اسکی پیروی کی توفیق دے
- اےاللہ تو ہمیں باطل کوباطل دکھا اوراس سےبچنےکی توفیق دے۔

تدوین اور حفظ متن دستاویزی تحقیق کا ایک اہم شعبہ ہے جس کی پہلی موثر ترین مثال تدوین قرآن کی صورت میں سامنے آتی ہے۔اس دور کے مروج رسم الخط اور اسکے پیش رو خط سے متعلق ضروری

معلومات، سامان کتابت کی تفصیل، کاتبوں کے حالات، مضمون کے کوائف، سورتوں کی ترتیبات، ناقلین کے نسخوں میں توافق، جامعین قرآن، غرض کہ تمام متعلق پہلوؤں کا ایسا کافی و وافی ذخیرہ ہے جو صاف ظاہر کر رہا ہے کہ یہ کام پوری احتیاط اور تحقیق کے ساتھ عمل میں آیا ہے۔

اسلامی معاشرے میں تحقیق کی دوسری راسخ روایت تدوین حدیث کی صورت میں روبہ عمل آئی جس پر معلومات کا بنیادی ذخیرہ عربی میں ہے اور جسکو اردو میں بالخصوص دو فاضلین نے پیش کیا۔ اول مولانا شبلی مرحوم نے سیرۃ النبیؐ کے حوالے سے اپنی تصنیف "سیرۃ النبی" جلد اول کے مقدمے میں، اور پھر ہمارے اپنے زمانے میں ڈاکٹر غلام مصطفی خاں صاحب نے ادبی تحقیق کے ساتھ اس کا باہمی تعلق قائم کرتے ہوئے اپنے مقالے "فن تحقیق" میں۔ جن کا ماحصل یہ ہے کہ محدثین نے روایت اور درایت کے جو اصول تحقیق منضبط کیے ہیں ان پر جسقدر فخر کیا جائے کم ہے۔ روایت کے بارے میں ان کے حزم و احتیاط کا عالم یہ تھا کہ وہ حالات اس وقت تک بیان نہیں کرتے جب تک کہ ان کے پاس آخری راوی سے لے کر چشم دید گواہ تک تسلسل کے ساتھ روایت موجود نہ ہو، یعنی جو واقعہ لیا جائے وہ اس شخص کی زبانی ہو جو خود شریک واقعہ رہا ہو، اور اگر وہ خود شریک واقعہ نہیں تھا تو اس واقعے تک تمام درمیانی راویوں کے نام ترتیب کے ساتھ بیان کیے جائیں، اور ساتھ ہی یہ بھی تحقیق کی جائے کہ وہ لوگ کون تھے؟ ان کے مشاغل کیا تھے؟ ان کا کردار کیسا تھا؟ ان کی سمجھ کیسی تھی؟ ثقہ کہاں تک تھے؟ سطحی الذہن تھے یا نکتہ رس تھے؟ عالم تھے یا

جاهل؟ ان تمام جزئی باتوں کا پتا لگانا بے حد دشوار تھا لیکن هزاروں محدثین نے اس کام کے لیے اپنی عمریں وقف کردیں اور ان تحقیقات سے اسماء الرجال کا ایک بے مثل فن ایجاد کیا جس کی
٦ بدولت راویوں کے صحیح حالات معلوم هوسکتے هیں۔ اگر کسی راوی پر کذب، تہمت، بدعت، غفلت، ثقات کی مخالفت یا حافظے کی کمزوری وغیرہ کا الزام هے تو محدثین نے بلا تکلف اس کو مجروح اور اس کی روایات کو رد کیے جانے کے قابل قرار دیا هے۔ روایت کے بعد درایت هے یعنی ایک حدیث کے تمام راوی شروع سے آخر تک ثقہ اور مستند تو ضرور هیں لیکن ممکن هے کہ عقلاً اس روایت میں کوئی خامی موجود هو، چنانچہ ایسی روایت بھی غیر معتبر قرار دی گئی هے۔ محدثین نے درایت یعنی عقلی حیثیت سے روایتوں کو پرکھنے کے لیے اصول قائم کیے هیں: واقعہ مذکور کیا اصول عادت کی رو سے ممکن هے یا نہیں؟ اس زمانے میں لوگوں کا عام میلان کیا واقعے کے مخالف تھا یا موافق؟ اگر واقعہ کسی حد تک غیر معمولی هے تو اسی نسبت سے ثبوت کی شہادت زیادہ قوی هے یا نہیں؟ واقعے کے متعلق راوی کے قیاس اور رائے کو کہاں تک دخل حاصل هے؟ راوی نے واقعے کو جس صورت میں ظاهر کیا هے وہ واقعے کی پوری تصویر هے یا اس امر کا احتمال هے کہ راوی اس واقعے کے هر پہلو پر نظر نہیں ڈال سکا اور اس کی تمام خصوصیات کا جائزہ نہیں لے سکا؟ اس امر کا اندازہ لگانا بھی ضروری هے کہ زمانے کے امتداد اور مختلف راویوں کے طریقۂ ادا نے واقعے میں کیا کیا اور کس کس قسم کے تغیرات پیدا کردیئے هیں۔

بلاشبہ محدثین کے یہ اصول تحقیق نہایت قوی هیں۔ انہی کے سلسلے کے وہ اصول هیں جو موضوعات کی تحقیق کے لیے خاص

ہیں۔ ملا علی قاری کی موضوعات اسی خاص پہلو پر ہے۔ یہ تحقیق کا ایک اہم گوشہ ہے۔ اس میں جعلی حدیثوں کے نامعتبر ہونے کے اصول تفصیل سے پیش کیے ہیں جو ملخصاً یہ ہیں کہ جس "حدیث" میں فضول باتیں ہوں، جو مشاہدے کے خلاف ہو، جو صریح حدیثوں کے خلاف ہو، جو واقع کے خلاف ہو، جو انبیاء کے کلام سے مشابہت نہ رکھتی ہو، جس میں بقید تاریخ پیش گوئی مذکور ہو، جو طبیبوں کے کلام سے مشابہ ہو، جس کے غلط ہونے کے دلائل موجود ہوں، جو صریح قرآن کے خلاف ہو، جس کے الفاظ رکیک ہوں ایسی "حدیث" نامعتبر ہے۔ اسی طرح وہ حدیثیں بھی جو خضر علیہ السلام کے متعلق ہیں یا وہ جو قرآن مجید کی الگ الگ سورتوں کے فضائل میں وارد ہیں۔

ان اصولوں کو ملا علی قاری نے عمدہ طور پر منطبق بھی کیا ہے۔ اور ایک روایت کی تحقیق میں اُن کے دلائل دور تک جاتے ہیں۔ چنانچہ اس روایت پر کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے یہودیوں کو جزیہ معاف کردیا تھا اور معافی کی دستاویز لکھوادی تھی، ان کا طرز استدلال محدثین کے انداز تحقیق کا اچھا نمونہ ہے۔ وہ اس روایت کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ مختلف وجوہ سے باطل ہے: اول یہ کہ اس معاہدے پر سعد رض بن معاذ کی گواہی بیان کی جاتی ہے حالانکہ وہ غزوۂ خندق میں وفات پاچکے تھے، دوسرے یہ کہ دستاویز میں کاتب کا نام معاویہ ہے حالانکہ وہ فتح مکہ میں اسلام لائے، تیسرے یہ کہ اس وقت تک جزیے کا حکم ہی نہیں آیا تھا، جزیے کا حکم قرآن مجید میں جنگ تبوک کے بعد نازل ہوا ہے؟ چوتھے یہ کہ دستاویز میں تحریر ہے کہ

یہودیوں سے بیگار نہیں لی جائے گی حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بیگار کا رواج ھی نہ تھا؟ پانچویں یہ کہ خیبر والوں نے اسلام کی سخت مخالفت کی تھی، ان کو جزیہ کیوں معاف کیا جاتا؟ چھٹے یہ کہ عرب کے دور دراز حصوں میں جب جزیہ معاف نہیں ھوا، حالانکہ ان لوگوں نے چنداں مخالفت اور دشمنی نہیں کی تھی تو خیبر والے کیونکر معاف ھوسکتے تھے؟ ساتویں یہ کہ اگر جزیہ ان کو معاف کردیا گیا ھوتا تو یہ اس بات کی دلیل تھی کہ وہ اسلام کے ھوا خواہ اور دوست اور واجب الرعایتہ ھیں حالانکہ چند روز کے بعد خارج البلد کردیئے گئے۔

حدیث کے حوالے سے تحقیق کے فن کو ترقی دینے والوں میں حاکم نیساپوری ایک بڑا درجہ رکھتے ھیں وہ چوتھی صدی ھجری کے محقق محدث ھیں۔ انہوں نے اپنی "معرفتہ علوم الحدیث" میں حدیث کی تحقیق کو وہ وسعت دی کہ شاید و باید۔ انہوں نے حدیثوں کو پچاس قسموں پر منقسم کیا، اِس طرح پر کہ ھر قسم ایک اصول تحقیق پر مبنی ھے؛ وہ اس اصول تحقیق کی تشریح بھی کرتے جاتے ھیں اور مثالیں دے دے کر کئی مختلف صورتوں میں اسے منطبق کرتے جاتے ھیں۔ یہ اصول آج ابھی بیانات کو حقائق سے ممیز کرنے میں کار آمد ھیں۔ ان میں سے چند کا ذکر تو یہاں ضروری معلوم ھوتا ھے۔ حاکم کا پہلا اصول اسناد کی آخری کڑی کی واقفیت حاصل کرنے سے متعلق ھے۔ اس کے تحت کسی اِسناد کی پوری کڑیاں معلوم کرنا سنت صحیح سے ثابت ھے اور یہ کہ انسان کو اِسناد کی اوپر کی کڑی معلوم کرنے کی اور نیچے کی کڑی پر اکتفا نہ کرنے کی اجازت ھے اگرچہ اس نے ثقہ آدمی سے سنا ھو۔ اسکی دلیل صحیح مسلم میں موجود ھے اور یہ کہ سند کے عالی

ہونے کا مفہوم محض کڑیاں گننا بھی نہیں، اسکی شناخت عقل و فہم سے ہوتی ہے۔ حاکم کی ان تصریحات سے اولین ماخذ کی اہمیت پر بخوبی روشنی پڑتی ہے، ثانوی ماخذ کے مقابلے میں اولین ماخذ کی تلاش و تحقیق دستاویزی تحقیق کے بنیادی اصولوں میں سے ہے اور اس کی بہترین صورت علوم حدیث ہی میں ملتی ہے۔ حاکم کا تیسرا اصول محدث کے بارے میں یہ معلومات حاصل کرنا ہے کہ اسانید کے متعلق اس کا صدق، اتقان، تحقیق و تفحص، اصول کی صحت، عمر، وفات، پھر غفلت (بھول) اپنا یا اپنے علم اور اصول کے اِستخفاف وغیرہ کا کیا حال ہے۔ یہ ایک عمدہ اصول تحقیق ہے جس کا لحاظ کر کے ہم اپنے مورخوں، ادبی مورخوں، تذکرہ نویسوں، وقائع نگاروں کے بیانات کے بارے میں بہتر داد تحقیق دے سکتے ہیں۔ حاکم نے اپنے ساتویں اصول میں صحابہ کو ان کے درجات کے مطابق پہچاننے پر زور دیا ہے۔ ادبی تحقیق میں یہی اصول درجہ بہ درجہ شعراء و مصنفین کی پہچان پر صادق آئے گا۔ راقم ناچیز کی رائے میں اردو اور فارسی کے ارباب تحقیق میں شیرانی اور قاضی عبدالودود نے اسی پہچان کی بدولت اختصاص پایا ہے۔ اسی طرح حاکم نے جرح و تعدیل، صحیح و سقیم کی پہچان، احادیث سے اخذ نکات، ناسخ و منسوخ، غریب الفاظ، غریب المتن، غریب السند حدیثوں کی تحقیق، تدلیس اور مدلّسین جن کی وہ چھے صورتیں سامنے لاتا ہے، پھر تعلیل، شاذ روایات، صحت و سقم میں برابری رکھنے والی متناقض یا متعارض روایتیں، تعارض نہ رکھنے والی روایتیں، روایت میں زائد الفاظ کی پہچان، محدثین کے مختلف مسلکوں کا علم، مذاکرہ جسکے ذریعے سچے اور جھوٹے کا فرق معلوم ہوتا ہے، متن میں تصحیفات یا ردوبدل، اسانید میں تصحیفات یا ردوبدل، راویوں کے اخوان اور قبائل سے واقفیت،

انساب کا علم، ناموں کی تحقیق، کنیتوں سے واقفیت، راویوں کے شہر و وطن کا علم، انکے موالی یا اولاد موالی ہونے کی واقفیت، عمریں (ولادت و وفات)، القاب، متشابہات یعني کتابت میں ملتے جلتے ناموں اور کنیتوں سے واقفیت وغیرہ وغیرہ کو لیا ہے ان سب کے بارے میں وہ مثالوں کے ساتھ اصول پیش کرتا ہے جو ایک مناسب تطبیق کے ساتھ ادبی تحقیق میں بھی کار آمد ہیں اور ہزار سال سے اس ذوق تحقیق کی آبیاری کررہے ہیں جس کے وارث اور امین اب ہمارے فضلائے عصر ہیں۔

چوتھی صدی ہجری ہی میں ایک تیسری قابل ذکر تحقیقی روایت رو بہ عمل آئی۔ یہ ابن ندیم کی الفہرست ہے جو تحقیقی کتابیات کا عظیم کارنامہ ہے۔ اس دور کے انداز تحقیق کو اس کتاب کی مدد سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ تحقیقی کتابیات آج بھی دستاویزی تحقیق کے شعبوں میں سے ایک اہم شعبہ ہے جس کی طرف وقت کے بہترین فضلا متوجہ رہے ہیں، اور ہیں۔

ابن ندیم کی الفہرست ایک ضخیم کتاب ہے اور اس کے موضوعات و مباحث کثیر اور متنوع ہیں، جن میں موقع بموقع اس نے تحقیق سے کام لے کر اپنی کتاب کو وقیع بنایا ہے۔ دوران مباحث سوال اٹھاتے جانا اور ان کا حل تلاش کرنا، یا دوسرے لفظوں میں اپنے چھوٹے چھوٹے ہدف بنا کر اپنی معلومات کو زیادہ نتیجہ خیز بنانا اس کا طریقہ ہے۔ وہ تاریخیت کا لحاظ کرتا ہے۔ متعدد مباحث میں تمام قابل تنقیم مواد کا احاطہ کرتا ہے، مصنف کی لکھی ہوئی تحریر سے استناد کرتا ہے (ص ۱۱، ۲۷)، اپنی دیکھی ہوئی دستاویزات کی صراحت کرتا جاتا ہے (ص ۱۴،۱۵)، نتائج اخذ کر کے پیش کرتا

جاتا ہے، بنیادی ماخذ کی اہمیت سے واقف ہے (ص ۲۹)۔ تقابل اور تحقیق متن کی طرف بھی پوری طرح متوجہ ہے (ص ٦۹)، اور کیوں نہ ہو کہ وہ خود ورّاق ہے۔ وہ اختلافات متن کی نشان دہی کے ساتھ ساتھ ناقلین کی کمزوریوں کو بھی ظاہر کرتا ہے، یہاں تک کہ خود کو بھی نہیں بخشتا، چنانچہ ایک اختلافی بحث کا خاتمہ وہ اس جملے پر کرتا ہے کہ ہم نے ان کا یہ قول بغیر دیکھے ہی نقل کردیا ہے (ص ٦۹)۔ بہرکیف یہ ایک کمزوری ہے جس کا وہ خود معترف ہے گو کہ اس اعتراف میں بھی ایک احتیاط ہے اور یہی صورت الفہرست میں بعض دیگر مقامات پر بھی سامنے آتی ہے۔ وہ کہیں کہیں مجہول روایت اور رائے بھی نقل کرتا ہے مگر اس صورت میں کہ مثلاً دو معروف آرا یا روایات دیں تو ان کی تائید مزید میں ایک بے نام یا مجہول راوی کی روایت یا رائے بھی۔ کہیں وہ اپنی نارسائی کا صاف اعتراف کرلیتا ہے کہ فلاں بات معلوم نہ ہوسکی، یہ قابل تحقیق بات ہے۔ یہ اعتراف خود اس کے اعلیٰ ذوق تحقیق پر دال ہے اور کاش یہی چیز ہمارے آج کے طالبان تحقیق میں ایک راسخ روایت بن کر ابھر آتی۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ابن ندیم قدیم نوشتہ جات اور نادر الوجود تحریروں میں خاص دل چسپی رکھتا ہے، سماع کتاب، استدراک، متون میں خطا و تحریف کی نشان دہی (ص ۱۱۴) کی اہمیت پر زور دیتا ہے۔ اس کا ایک محتاط انداز ہے جو قدیم انداز تحقیق کی بہتر نمائندگی کرتا ہے۔ چنانچہ ایک خاص گروہ کے بارے میں یوں اظہار رائے کرتا ہے کہ اسکے قائدین کی تعداد تو بہت زیادہ ہے لیکن وہ سب اصحاب تصنیف نہیں ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہم ایک شخص کے بارے میں یہ سمجھتے ہوں کہ وہ صاحب تصنیف

نہیں مگر وہ حقیقت صاحب تصنیف ہو اور اس کی تصنیف ہم تک نہ پہنچی ہو کیونکہ ان کی کتابیں مخفی اور محفوظ رکھی جاتی ہیں۔ (ص ۴۴۰)۔ اسی طرح کے ایک اور گروہ سے متعلق معلومات پیش کرتے ہوئے وہ اپنے ماخذ کا حوالہ دےکر صاف لکھ دیتا ہے کہ اس سلسلے میں صدق اور کذب کی ذمے داریوں سے بری ہوں (ص۴۴۹)۔ اسی طرح حسب موقع یہ بھی لکھنے میں کوئی سبکی محسوس نہیں کرتا کہ و اللہ اعلم بحقیقت و بطلانہ (ص ۴۵۴) کہ یہی ارباب تحقیق کا طریقہ رہا ہے۔ صاف گوئی بھی اس میں ایسی ہے جو ہر محقق کے لیے باعث تحسین قرار پائے گی۔ چنانچہ اسماعیلیہ کے ایک کثیرالکتب مصنف کے بارے میں صراحت کرتا ہے کہ اسکی تصنیفات سب سے زیادہ ہیں کیونکہ جس کسی نے بھی کوئی کتاب لکھی اسکی جانب منسوب کردی؛ اسکی یہ یہ تصنیفات احمقانہ ہیں جو موجود اور متداول ہیں، باقی مشمولات فہرست کو نہ ہم نے دیکھا اور نہ اسکو دیکھنے والے کسی شخص کا سراغ مل سکا۔ اسی مصنف کی ایک اور کتاب پر صاف صاف رائے ظاہر کرتا ہے کہ یہ کتاب میں نے پڑھی ہے، اس میں بڑی جسارت اور بیہودگی ہے یعنی اباحت، محظورات، اور شرائع اور متبعین شرائع کی توہین۔

تحقیق کے لیے ایک بہتر اور شاندار کتاب خانے کا اس کا ایک تصور ہے (ص ۳۱۲)۔ کبھی وہ بربنائے احتیاط فیصلہ صادر کرنے سے گریز بھی کرتا ہے جبکہ معلومات پورے طور پر ہمدست نہ ہوں (ص ۳۱۹) چھان بین (Siftirg) اور درست پیش کش (Presentation) کے معاملے میں بھی وہ خاصا آگے ہے، چنانچہ حسب موقع صراحت کرتا جاتا ہے کہ فلاں شخص کے بارے میں اور اس کی کتابوں کے بارے

میں ہماری جو تحقیق ہے ہم انشاء اللہ اسے کتاب کے اصل مقام پر بیان کریں گے (ص ۳۲۱)۔

کتابوں میں جعل سازی کی نشان دھی کے بارے میں ابن ندیم خاصا مستعد ہے۔ (ص ۳۳)۔ کونسا جزو اصل مصنف کی تصنیف ہے کونسے حصے وراقوں کی جعل سازی ہیں، جعل سازی میں کس نے پہل کی، کون شریک تھا، اور کتاب کے اجزائے تر کیبی کیا ہیں، غرض کہ سب پہلوؤں پر وہ روشنی ڈالتا ہے (ص ۳۳۰)۔ وہ ایک خاص مسلک کا پیرو ہے مگر کتابوں کی چھان بین کے ذیل میں ہم مسلکوں پر بھی بھرپور تنقید اور بے لاگ رائے کا اظہار کرتا ہے۔ (ص ۲۳۹، ۳۴۲، ۵۱۹، ۵۲۷)۔ وہ درایت اور تالیف میں مہارت اور حذاقت کی تحسین کرتا ہے (ص ۳۴۱) ۔ وہ مصنفوں کے ذاتی کتب خانوں کی مدد سے خود انھی کی تالیفات میں اخذونقل کا سراغ لگانے کا قائل ہے چنانچہ لکھتا ہے کہ میں نے خود صولی (ابوبکر صولی) کے کتب خانے میں اس شخص کا وہ مجموعہ دیکھا ہے کہ جس سے اس نے نقل کیا ہے اور جسکی وجہ سے یہ رسوا ہوا ہے (ص ۲۴۸)۔ تعریف کی جگہ تعریف اور ذم کی جگہ ذم (ص ۳۵۱)، ایک شک کے ساتھ بیان جہاں اسکا موقع ہو، (ص ۳۵۲، ۳۴۸)، اور توضیح مصطلحات (ص ۳۷۰) بھی اس کے انداز تحقیق کی خصوصیات میں سے ہیں۔

ابونواس کے ذیل میں وہ شعرا کے کلام کی تدوین کے مروج طریقوں سے روشناس کراتا ہے۔ اول ایک شخص نے ترتیب حروف کی رعایت کے بغیر شعر جمع کیے، اس نے اسکو دس اصناف پر تقسیم کیا۔ پھر گروہ علماء میں سے ایک شخص نے انکی شرح و وضاحت کی، اس نے بھی اسے دس اصناف پر تقسیم کیا۔ اھل ادب میں سے

کچھ نے بہ ترتیب حروف جمع کیا، کچھ نے اسکے واقعات بھی جمع کیے اور منتخب اشعار بھی، ایک نے ایک رسالہ اسکے معائب اور سرقات کے موضوع پر لکھا، دوسرے نے دفاع کیا اور اسکے محاسن بھی بیان کیے۔ اس طور پر تیسری اور چوتھی صدی ھجری میں تدوین اشعار کے طریقے کا ایک خاکہ سامنے آتا ہے ۔ (ص ۳۷۲)۔ (۱)

وہ اپنے زمانے کے شعراء میں نئے پرانے کا فرق ملحوظ رکھتا ھے، چنانچہ ایک شاعر کے بارے میں کہتا ھے کہ نئے دور کا شاعر ھے (ص ۹۸م)۔ جو دس ورق سے کم کلام رکھتا ھو کم گو ھے گو کہ محض کثرت اوراق کافی نہیں (ص ۳۷۱)۔ سرقہ کی نشان دھی میں بھی وہ بہت مستعد ھے (ص ۳۰۶، ۳۹۷) جیسا کہ شعراء اور افسانہ گویوں کے بیان میں اس نے کیا ھے۔ یہ ھر دور میں ادبی تحقیق کا ایک اھم شعبہ رھا ھے کہ سرقات کا پتا چلایا جائے۔

تحقیق کے نتائج تک پہنچنا اکثر صبر آزما ھوتا ھے۔ ابن ندیم بھی الفہرست میں اجرائے حکم میں جلد بازی کی مذمت کرتا نظر آتا ھے (ص ۸۸م)۔ وہ نقل قول میں احتیاط کا قائل ھے (ص ۵۱۳، ۵۶۲)۔ تاھم ایک جگہ خود اس کی اپنی کتاب کا متن اس کمزوری کا شکار نظر آتا ھے جہاں بعد کے کسی مرتب نے اپنے قول کو الفہرست

---

(۱) وہ علی بن حمزہ اصفہانی کی تحسین کرتا ھے کہ اس نے اشعار کو عمدگی اور سلیقے سے ترتیب دیا ۔ اس میں ترتیب حروف کے بجائے ترتیب الْواع ھے ص ۳۸۷۔ اور وہ ایک اور موقعے پر اس کی بھی تحسین کرتا ھے کہ مجموعہ تمام دستیاب نسخوں کی مدد سے تیار کیا گیا ھے۔ ص ۳۸۷

کے متن میں داخل کرلیا ہے۔ ص ۵۵۱ وہ معرفت حدیث کے لیے عالم و پارسا اور ماہر لغت اور حافظ ہونے کی خوبی کی نشان دہی کرتا ہے (ص ۵۴۱)۔ ناتمام اور منقطع تاریخی کتابوں کے سلسلے کو آخر تک پہنچانے کے لیے وہی حالات کا اضافہ کرنے کے اہل ہیں جو حکومتوں سے متعلق رہے ہیں اور اہل علم میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ جو لوگ نہ حکومتوں سے متعلق رہے ہیں اور نہ اہل علم میں ان کا شمار ہوتا ہے ان کا الحاق و اضافہ لائق استناد اور قابل اعتناء نہیں (ص ۵۴۸)۔ وسائل تحقیق کی حفاظت کے اہتمام میں بھی اس کی دلچسپی ظاہر ہے (ص ۵۶۳)۔ اہم مصنفوں کی تلخیص (ص ۵۸۵)، تراجم، اصلاح، تشریح و توضیح (ص ۵۷۳) نقد و کلام (ص ۵۷۸)، ایک کا شرح کرنا، دوسرے کا پوری کتاب کو ہدف تنقید ٹھہرانا (ص ۵۸۶) ترقی تحقیق کے لیے مقالات اور مباحثے (ص ۶۶۶)، تحقیق کے لیے ملکوں ملکوں گھومنا، (ص ۶۷۶)، چشم دید معلومات اکٹھی کرنا ص ۷۹۸، غرض کہ بکثرت ایسے اشارات اس کی کتاب میں یکجا ہیں، جو اس کے انداز تحقیق کی عکاسی کرتے ہیں۔

حلاج اور اس کے مذہب سے متعلق ابن ندیم کا ایک واضح تحقیقی رویہ ہے۔ حلاج کی سرگرمیاں ۲۹۹ھ میں اسکی گرفتاری کا باعث بنی تھیں جبکہ الفہرست ابن ندیم نے ۳۷۷ھ میں تصنیف کی۔ گویا وہ قریب العہد ہے۔ اول وہ حلاج کے نام اور مولد و منشا کا ذکر کرتا ہے اور مختلف روایتیں پیش کرکے بتاتا ہے کہ اس کے اور اس کے مولد و منشاء کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کوئی بات نہیں کہی جاسکتی۔ پھر ابوالحسین عبیداللہ بن احمد بن ابوطاہر کی تحریر کے حوالے سے جسے اس نے خود پڑھا ہے بیان کرتا ہے کہ وہ کیسا آدمی تھا۔ اس کا ماحصل یہ ہے کہ حسین بن منصور حلاج

ایک افسوں گر اور شعبدہ باز آدمی تھا۔ تمام علوم کا ماہر و عالم ہونے کا مدعی تھا حالانکہ کورا تھا۔ اپنے پیروؤں کے سامنے اپنی الوہیت کا دعویٰ کرتا اور حلول کا اظہار کرتا، بادشاہوں کے سامنے خود کو شیعہ اور عامہ (اہل سنت) کے سامنے خود کو صوفی منش ظاہر کرتا تھا۔ پھر وہ تائیداً ایک اور روایت بیان کرتا ہے جس کے راوی کا نام نہیں بتایا، اس روایت میں آسے شعبدہ بازی کا مرتکب بتایا گیا ہے۔ تیسری روایت اس کی گرفتاری کی وجہ سے متعلق ایک معلوم راوی کی تحریر ہے۔وہ لکھتا ہے کہ میں نے ابوالحسن بن سنان کی تحریر میں ایسا اور ایسا پڑھا ہے۔ اس تحریر کے حوالے سے حلاج کے قتل اور پھر نذر آتش ہونے تک کے واقعات سامنے آجاتے ہیں۔ اور ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ دو معروف اور معین راویوں کی روایت کے ساتھ تائیداً تیسری مجہول روایت لانے میں وہ کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا۔

اب ہم ایک طویل فاصلہ طے کر کے آٹھویں صدی ہجری تک آتے ہیں۔ یہ ابن خلدون کی صدی ہے۔ وہ تاریخ کے حوالے سے کچھ، اصول تحقیق بالوضاحت پیش کرتا ہے۔ بالخصوص اپنے مقدمے میں۔ اس کا کہنا ہے کہ ضرورت ہے متعدد ماخذوں کا پتا لگایا جائے۔ مختلف علوم سے واقفیت حاصل کی جائے۔ اور مورخ فکر صحیح اور گہری نظر بھی رکھتا ہو کہ اس کے ذریعے وہ حق و صداقت کی راہ پا سکے اور لغزشوں اور اغلاط سے دامن بچاسکے، کیونکہ اخبار میں اگر محض نقل پر نظر محدود رکھی جائے اور اصول عادت، قواعد سیاست، طبیعت تمدن اور اجتماع انسانی کے حالات کو پیش نظر نہ رکھا جائے اور نہ غائب و غیر موجود کو حاضر و موجود پر قیاس کیا جائے تو غلطی، لغزش قدم اور سچائی کے راستے سے ہٹ جانے

کے خطرے سے نجات نہیں مل‌سکتی۔ چنانچہ اکثر و بیشتر مؤرخین مفسرین اور ناقلین نقل حکایات و وقائع میں غلطیوں کے شکار ہوگئے ہیں محض اس لیے کہ انھوں نے صرف نقل پر بھروسہ کیا، خواہ وہ قابل رد ہو یا قابل قبول، اور ان کو نہ اصول پر کسا، نہ ان کے متشابہات پر قیاس کیا، نہ معیار حکمت اور طبائع کائنات کی واقفیت پر ان کو پرکھا اور جانچا اور نہ اخبار پر گہری نظر ڈالی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حق سے بہک گئے اور وہم و غلطی کے جنگل میں بھٹکتے پھرے۔ خصوصاً جبکہ حکایات میں مالوں اور فوجوں کے شمار اور گنتی کی نوبت آئی کیونکہ حکایات میں جھوٹ اور غلط بیانی کی بڑی گنجائش ہے۔ اس لیے ضرور ہے کہ ان کو اصول پر جانچیں اور قواعد پر پرکھیں (ص ۳۹)۔

وہ کہتا ہے کہ انسان طبعاً عجیب بات کہنے کا دلدادہ ہے اور اعتراض یا تنقید سے غفلت برتتے ہوئے اس کو جلد زبان پر لے آنے کا عادی ہے۔ وہ نفس کی بھول چوک یا اس کے ارادے پر اس کی جانچ پڑتال نہیں کرتا۔ اور وہ نقل خبر میں واسطے یا چھان بین سے سروکار نہیں رکھتا اور خبروں کو بحث و تمحیص کی کسوٹی پر نہیں کستا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زبان کی لگام کو ڈھیل دے دیتا ہے اور اس کو جھوٹ کے میدان میں خوب آزادی بخشتا ہے اور اس طرح اللہ کی آیات کا مذاق بناتا ہے اور لغو باتوں کی اشاعت کرکے دوسروں کو گمراہ کرتا ہے (ص ۴۱)۔ لہذا اس قسم کی خبریں جب تم تک پہنچیں تو فوراً باور نہ کرو بلکہ غور و فکر کرو اور قوانین صحیحہ پر ان کو پرکھو اور جانچو۔ حقیقت حال تم پر روشن ہوجائے گی اور اللہ ہی راہ حق دکھانے والا ہے (ص ۴۳)۔

وہ صراحت کرتا ہے کہ کتب تاریخ میں بیہودہ حکایات کے گھڑنے اور بنانے کا راز یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ناقلین خود ناجائز لذتوں میں پھنسے ہوئے تھے اور دوسروں کی پردہ دری کیا کرتے تھے (ص ۵۱)۔

اس کے نزدیک مورخ کے لیے لابدی ہے کہ وہ ملکی سیاسی قواعد اور موجودات کے طبائع سے واقفیت رکھتا ہو۔ قومیں اور زمین و زمان، عادات و اخلاق، سیرت و خصلت، مذهب و ملت اور دیگر حالات میں جن انقلابی دوروں سے گذرتی رہتی ہیں ان سے بھی وہ شناسا ہو، نیز قابلیت رکھتا ہو کہ حاضر و موجود کو غائب و غیر موجود سے ملا کر دیکھے کہ ان میں اتفاق ہے یا اختلاف، اتفاق کی بھی علت تلاش کرے اور اختلاف کی بھی وجہ دریافت کرے، اور سلطنتوں اور قوموں کے اصول، ان کی ابتدا اور ان کے حدوث کے اسباب و دواعی کی معلومات بھی بہم پہنچائے، اور جو اشخاص ان امور میں ذمے دارانہ شخصیت رکھتے ہوں ان کے حالات و اخبار سے بھی شناسائی رکھتا ہو تا کہ وہ ان معلومات کے تحت ہر خبر کے سبب کا سراغ لگا سکے اور جو خبر اس تک نقل ہو کر پہنچی ہے اگر وہ اس کے قواعد و اصول پر پوری اترتی ہے تو اس کو صحیح جانے ورنہ اس کو کھوٹی اور جھوٹی جان کر نظر انداز کردے (ص ۵۸)۔

وہ اس امر پر بہت زور دیتا ہے کہ اهل عالم اور قوموں کے حالات و عادات و مذاهب ایک نہج و وطیرہ پر نہیں چلتے رہتے بلکہ اختلاف ایام و زمانہ کے ساتھ ساتھ وہ بھی ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف بدلتے رہتے ہیں، جس طرح لوگ اور آبادیاں ایک

حالت پر برقرار نہیں رہتیں، اسی طرح سطح زمین، زمانہ اور سلطنتوں کو بھی ثبات و قرار نہیں۔ اللہ کی یہی عادت اپنے بندوں میں جاری ہے (ص ۵۹)۔ جو اس کا لحاظ رکھے گا تاریخی تحقیق میں ایک غلطی کے سرزد ہونے سے بچ جائے گا۔

یہ بھی اسی کا قول ہے کہ جس چیز کو لوگوں نے نہ دیکھا ہو اس کی خبر کو بے دھڑک جھٹلا بیٹھتے ہیں، بالکل جس طرح عجوبہ پسندی کی وجہ سے اکثر ناممکن باتوں کو لوگ مان لیا کرتے ہیں۔ پس انسان کے لیے مناسب یہی ہے کہ ہر خبر و روایت کو اصول پر پرکھے اور جانچے اور بے لوث ہوکر عقل سلیم و طبع مستقیم سے ممکن و ممتنع میں صحیح صحیح فرق و تمیز کرے، جو دائرۂ امکان میں ہو اس کو قبولیت کا درجہ دے اور جو اس سے خارج ہو اس کو رد کردے۔ مگر یہاں امکان سے مراد امکان عقلی نہیں جس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ کیونکہ وہ واقعات میں کوئی حد قائم نہیں کرسکتا۔ بلکہ اس سے مراد امکان مادی ہے یعنی جب ہم کسی شے کی جنس و صفت، مقدار عظمت و قوت کا پتا لگالیں تو پھر اسی نسبت سے اس کے حالات پر حکم لگائیں اور جو مذکورہ بالا امور سے خارج و زائد معلوم ہو اس کو ممتنع جانیں (ص ۲۰۹)۔

ان تصریحات کے بعد اب ہمیں برصغیر کی طرف آنا چاہیے۔ اس خطے میں گروہ علماء کی تحقیقی روایات کی بھی اپنی ایک طویل تاریخ ہے لیکن بہ نظر اختصار یہاں ادبی تحقیق کے دائرے میں رہنا مناسب معلوم ہوتا ہے، چنانچہ قدیم انداز تدوین کا اندازہ لگانے کے لیے عہد شاہجہانی کی ایک روشن مثال سامنے رکھی جاتی ہے۔

ہماری مراد ملا عبداللطیف بن عبداللہ عباسی (متوفی ۱۰۴۸ھ یا ۱۰۴۹ھ) سے ہے جو گجرات کا باشندہ تھا، وہ لشکر خان مشہدی

کا متوسل تھا جو عہد جہانگیری میں کابل کا دیوان اور عہدشاہجہانی میں اسی صوبے کا صوبیدار رہا تھا۔ ۱۰۲۴ھ سے ۱۰۳۲ھ تک عبداللطیف عباسی رومی کی مثنوی کے مختلف نسخوں کا مقابلہ (Collation) کرنے میں منہمک رہا۔ الفاظ کے رد و قبول میں یقیناً ذوق سلیم ھی اس کا رھنما رہا ھوگا، آج بھی ذوق سلیم ھی تدوین متن میں رھنمائی کرتا ھے۔ جیسا کہ وہ اپنے دیباچے موسوم مرآۃ المثنوی میں بیان کرتا ھے اس نے ۱۰۲۴ھ میں مثنوی کا مقابلہ کابل میں ایک مستند نسخے سے کیا، پھر ۱۰۲۵ھ میں پشاور کے مضافات میں ایک جگہ کے کئی نسخوں سے۔ اور جب وہ دکن کے سفر پر ۱۰۳۰ھ میں روانہ ھوا تو ایک دوست کی مدد سے اس کی چھان بین کی اور تنقیدی نظر ڈالی، پھر برھان پور میں ایک بار پھر مزید چار نسخوں سے مقابلہ کیا۔ اس نے مثنوی کا متن تیار کرنے میں اسّی (۸۰) نسخوں کاتقابلی مطالعہ کیا جو برصغیر میں تدوین متن کی تاریخ کا ایک غیرمعمولی کارنامہ ھے۔ اس پر مقدمہ لکھ کر حق تعارف ادا کیا، چھے دفتروں میں سے ھر دفتر کا تفصیلی اشاریہ ترتیب دیا، حاشیے میں اصل عربی دیبا چوں کی فارسی میں توضیحات درج کیں اور اختلافات قرأت اور حل لغات بھی۔ یہ انتقادی کارنامہ ۱۰۳۲ھ میں تکمیل کو پہنچا۔ اس اعلیٰ پائے کے کام کی تحسین سے حوصلہ پاکر اس نے سنائی کے حدیقے پر کام کا آغاز کیا۔ حدیقے کے مختلف نسخوں میں بکثرت اختلافات متن تھے۔ ۱۰۳۵ھ میں جب کہ عبداللطیف عباسی آگرے میں تھا، اُسے حدیقے کا ایک ایسا نادر نسخہ ملا جو اسکی تکمیل کے صرف اسّی (۸۰) سال بعد کا تھا، یہ نسخہ گجرات میں ۱۰۰۰ھ میں نواب مرزا محمد عزیز کوکلتاش المخاطب بہ خان اعظم کی صوبیداریٔ گجرات کے زمانے میں غزنیں سے لایا گیا تھا، پھر یہ مظفر خان بخشیٔ گجرات کو

حاصل ہوا جو ۱۰۳۵ھ میں آگرے میں صوبیدار مقرر ہو کر آیا۔ اِسی مظفر خان سے یہ قدیم نادر نسخہ عبداللطیف عباسی نے حاصل کیا اور اس کی نقل مطابق اصل تیار کی۔ مگر اس میں ابیات کم تھے اور بیس درمیانی اوراق گم تھے۔ ۱۰۳۷ھ میں جب وہ لاہور میں تھا تو اس نے حدیقۂ سنائی کے بہت سے نسخے جمع کرلیے اور تصحیح متن کے لیے مقابلہ و مذاکرہ کا آغاز کیا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد اس نے شرح اور حاشیے میں حل لغات کا اہتمام کیا، حدیقۂ سنائی کے سب نسخوں میں فہرست مشمولات نہیں تھی اس کا اضافہ کیا، اور آخری مرحلے میں اپنی تحقیقات ایک جداگانہ جلد میں پیش کیں جس کا نام لطائفُ الحدایق من نفایسِ الدقایق رکھا۔ یہ سب تفصیلات وہ خود اپنی شرح حدیقہ کے آغاز میں پیش کرتا ہے جس کا سندھی ادبی بورڈ میں موجود قلمی نسخہ ہمارے سامنے رہا ہے۔ شرح مثنوی کی طرح اس غیر معمولی تحقیقی کام میں بھی اس کا انہماک ایک مثال ہے۔ وہ ۱۰۴۰ھ، ۱۰۴۲ھ کے مابین اس کام پر نظرثانی میں مشغول رہا جیسا کہ میر الٰہی ہمدانی کے دو قطعاتِ تاریخ شاہد ہیں۔

اس قدیم اندازِ تحقیق کے تسلسل کو بہ آسانی آزاد بلگرامی تک پہنچایا جاسکتا ہے۔ اور طول دیا جائے تو ایک کتاب کا مواد مل سکتا ہے۔ پھر تحقیق کے اور بہت سے شعبے بھی ہیں جو رہ جاتے ہیں۔ لسانیات اور لغت کے حوالے سے خان آرزو کا ذکر تو آیا ہی نہیں جو بارھویں صدی ہجری میں قدیم اندازِ تحقیق کے ایک اچھے عالم و عامل ہیں۔ بہرکیف، سردست تو اس جائزے کو اسی اعتراف پر ختم کیا جاتا ہے کہ سخن باقیست۔

كتابيات :-

(١) شبلی نعمانی : سيرة النبی ، جلد اول، طبع چهارم، اعظم گڑھ، ١٣٣٢هہ.

(٢) ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان : تحقیقی جائزے، سکهر ، ١٩٦٨ع .

(٣) حاکم نیساپوری : معرفة علوم الحديث، مترجم مولانا محمد جعفر شاه پهلواروی ، لاهور ، ١٩٧٠ع .

(٤) ابن نديم : الفهرست ، مترجم مولانا محمد اسحاق بهٽي، لاهور ١٩٦٩ع.

(٥) ابن خلدون: مقدمہ ابن خلدون ، مترجم مولانا سعد حسن خان يوسفي ، کراچی، سنہ ندارد .

(٦) شرح حديقۂ سنائی (قلمی) مخزونہ سندھی ادبی بورڈ، جام شورو.